پروفیسر محمد عثمان

سرسیّد اور دو قومی نظریہ

جس سیاسی فکر اور نقطۂ نظر کی بدولت پاکستان معرضِ وجود میں آیا، اس کی داغ بیل سرسید نے ڈالی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی اور اس کے چند سال بعد ہندوؤں نے اس پر یوں قبضہ جمایا کہ وہ ان کے سیاسی نظریات اور عزائم کا زبردست پلیٹ فارم بن گئی۔ سرسید اس زمانے میں مسلمانوں کی ہمہ جہتی اصلاح کے علم بردار اور رہنما تھے اور انھوں نے سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں کی واضح اور مؤثر رہنمائی کا فرض انجام دیا۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور اس کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ وہ انگریزوں کی قوت، حسنِ انتظام اور ان کی تہذیب و معاشرت کی برتری کے دل سے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوستانیوں کو ان سے بہت کچھ سیکھنا ہے اور انھیں اس امن کی اشد ضرورت ہے جو انگریزی راج کی بدولت ملک کو میسر ہوا ہے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی، بالخصوص مسلمان، ہر قسم کے ہنگاموں سے دُور رہ کر جدید تعلیم سے اپنے آپ کو آراستہ کریں اور تہذیب و معاشرت کی ترقی میں قدم بڑھائیں۔ جب یہ ہو جائے گا تو سیاسی ترقی اس کے نتیجے میں خود بخود آجائے گی۔

سرسید نے بہت سوچ سمجھ کر اور بڑے پختہ یقین کے ساتھ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان دوستی کی فضا پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ بہت ناانصافیاں کیں اور ان پر بڑے مظالم توڑے۔ سرسید کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ اس کے باوجود واقعات کی منطق نے انھیں انگریزوں کی "اہمیت" اور "ضرورت" کا سبق دیا اور انھوں نے دیانت داری اور انشراحِ قلب کے ساتھ اس صورتِ حالات کو قبول کر کے دامے قدمے، سخنے اس امر کی کوشش کی کہ انگریز کا دل مسلمان کی طرف سے صاف ہو جائے اور

مسلمان انگریز کی حکومت کو، اس کی خیر و برکات کی وجہ سے دل سے قبول کرلے۔

اس نقطۂ نظر کا پہلا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا اور ایسا ہی ہوا کہ جب کانگریس نے ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ سیاسی تحریک کا آغاز کیا اور ملک کی آزادی اور ہوم رول کے مطالبات آہستہ آہستہ زبانوں پر آنے لگے تو سرسید احمد خاں نے اس خدشے کی بنا پر اس کی مخالفت کی کہ یہ تحریک انگریزوں اور ہندوستانیوں اور بالخصوص انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان پھر کسی بڑے تنازعے اور تصادم کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو اور خود سرسید کی سالہا سال کی وہ محنت اکارت نہ چلی جائے جس کی بدولت انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت اور رواداری کی فضا قائم ہو چلی تھی۔

کانگریس کی "ہنگامہ آرائی" کی مخالفت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ سرسید کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر مسلمان یوں سیاسیات میں پڑ گئے اور انھوں نے "مطالبات بازی" اور احتجاج آرائی شروع کر دی تو ان کی اصلاح و بہبود کا بنیادی کام یعنی جدید تعلیم حاصل کرنے کا مقصد ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر صحیح راستے سے بھٹک جائیں گے۔

یہ دو خدشے یعنی انگریزوں کی ناراضی مول لینے کا خدشہ اور دوم تعلیم کی سیدھی راہ سے بھٹک جانے کا خدشہ اوّلین محرک تھے۔ جب سرسید نے کانگریس کی پبلک طور پر مخالفت کی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس تحریک اور اس کی 'مطالبات بازی' سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔

انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کے یہ دو محرکات اگرچہ اپنی جگہ پر معقول اور مدلّل تھے اور مسلمانوں نے ان پر کان دھرے مگر محض ان دو وجوہ میں اتنی قوتِ استدلال نہ ہو سکتی تھی کہ جمہوریت اور آزادی کے بلند ہوتے ہوئے نعرے اس پر غالب نہ آجاتے، اور نہ ان دو وجوہ کی بنا پر خود سرسید ہی کوئی قابلِ ذکر سیاسی رہنما یا مفکّر کہلا سکتے تھے۔ ان کا اصلی کارنامہ یہ ہے اور اسی کی بدولت سیاسی امور میں بھی ان کا حلقۂ اثر روز بروز بڑھتا گیا کہ انھوں نے انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہندوستان کی سیاسی صورتِ حالات کا تجزیہ بہت گہری نظر اور بڑے منفرد طریق سے کیا۔ اس ضمن میں وہ نہ انگریزوں کی خواہش اور فکر کے پابند ہوئے اور نہ

ہندوؤں کے پیروکار۔ انھوں نے اپنے لیے وہ راہ اختیار کی جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے قومی مفاد اور تحفظ و ترقی کے لیے سب سے بہتر تھی۔

انھوں نے بے کھٹکے اعلان کیا کہ برطانوی طرزِ جمہوریت ہندوستان کے حالات کے لیے نہ مناسب ہے اور نہ قابلِ عمل۔ اس کے لیے انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ جمہوریت صرف انہی ملکوں میں منصفانہ طور سے چلائی جا سکتی ہے جہاں کی آبادی میں مذہب، تاریخ، معاشرت اور زبان وغیرہ کی 'ہم جنسیت' اور یگانگت پائی جاتی ہو۔ جیسے انگلستان یا فرانس یا جرمنی ہے کہ ان میں سے ہر ملک کے رہنے والوں میں تاریخ، زبان، معاشرت کے طور طریق اور مذہبی عقائد بڑی حد تک ایک ہیں اور ملک کے کسی ایک طبقے کو کسی دوسرے طبقے سے یا کسی ایک خطے کو کسی دوسرے خطے سے ان بنیادی امور میں مغائرت نہیں۔

سرسید نے 'ہم جنسیت' کو جمہوریت کے لیے شرطِ اوّل قرار دیا ہے اور اپنے موقف کے حق میں انگلستان، آئرلینڈ، ویلز اور یونان و روما کی تاریخ سے بڑی بڑی موثر مثالیں پیش کی ہیں جن سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ تہذیبی و ذہنی طور پر مختلف اور متغائر گروہوں پر جمہوریت ٹھونسنا خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ ان کے استدلال کے اس حصے کو ذرا ان ہی کی زبان سے سنیے:

"اس سے بہت پہلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا خیال بھی ہوا ہو، میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزنٹیٹو (Representative) گورنمنٹ ہندوستان کے مناسبِ حال ہے؟ اور جان اسٹوارٹ مل کی آرا بتائید ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ اوّل لازمی امر ایسے طریقۂ حکومت کے لیے جس کا انتظام صرف کثرتِ رائے سے چلتا ہو یہ ہے کہ ووٹرز (رائے دینے والوں) میں ہم جنسیت ہو، بلحاظ قوم کے اور مذہب کے اور عادات معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی و ملکی روایات کے یعنی ریپریزنٹیٹو طریقہ سے رائے دینے میں یہ مسلّم امر ہے کہ رائے دینے والوں میں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امورِ بالا میں ہو اور جب یہ باتیں موجود نہ ہوں یا ان کا خیال نہ کیا جائے تو ایسے ملک میں سوائے اُس ملک کے امن و بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔" (آخری مضامین سرسید، صفحہ ۴۶)۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"سلطنتِ جمہوری کی کامیابی کے لیے پہلی اور ضروری شرط یہ ہے کہ اس آبادی میں ہم جنسیت ہو، اور جتنے وہ زیادہ تر مشابہ ہوں اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ جمہوری حکومت میں ضروری خیال کر لیا جاتا ہے کہ افراد ایسے مشابہ ہیں جیسے دو مٹر کے دانے۔"

سرسید کے استدلال (یا اجتہاد) کا دوسرا قدم یہ تھا کہ انھوں نے ہندوستان کو ایک 'برِّاعظم' قرار دے کر اس بات پر زور دیا کہ یہاں ایک قوم نہیں، متعدد قومیں آباد ہیں جن کے تاریخی حالات، تمدنی و تہذیبی تصورات اور مذہب و معاشرت ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ صدیوں کی ہمسائیگی، معاشرتی لین دین اور (اسلامی پرچم تلے) ایک سلطنت بھی ان کے اختلاف کو دُور نہ کر سکی۔ ایسی صورت میں جمہوری اداروں کا قیام اس طبقے اور قوم کے لیے جس کی ملک میں اکثریت ہے، شاید مفید ہو مگر دوسروں کے لیے اور خاص طور سے مسلمانوں کے لیے جو ہندوستان کی سب سے بڑی متحد اقلیت ہے، قطعاً مفید نہیں ہو سکتا بلکہ ان کے لیے بے پناہ مصائب اور مشکلات پیدا کر دے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ کانگریس مطالبات کا جو دام پھیلا رہی ہے اور جمہوریت کے نام پر جو سحر پھونکا چاہتی ہے، وہ اس سے ہشیار رہیں اور اپنے نیک و بد کو پہچانیں۔ اس استدلال کے لیے میں یہاں ایک مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں۔ مذکورہ بالا مضمون ہی میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میں دل سے امید کرتا ہوں کہ انگلش پارلیمنٹ کے ارکان اس امر کو نہ بھلا دیں گے کہ ہندوستان ایک برِّاعظم ہے اور مثل انگلستان یا اسکاٹ لینڈ یا ویلز یا آئرلینڈ کے ایک چھوٹا سا ملک نہیں ہے اور اس میں وسیع مختلف آبادیاں ہیں جن کے تمدنی اور اخلاقی، سوشل اور پولیٹیکل اور مذہبی اور طبیعی اور تاریخی حالات بہت مختلف ہیں۔"

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ سرسید نے دو قومی نظریے کو سیاسی رنگ میں اور بڑے واشگاف لفظوں میں پیش کیا اور یہ خیال مسلمانوں کے ذہن میں نقش کرنے کی کوشش کی کہ ان کا قومی مفاد ہندوؤں سے الگ بھی ایک حقیقت رکھتا ہے جسے ان کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

دراصل کانگریس کا مقصد ابتدا ہی سے ایک تیر سے دو شکار کرنا تھا۔ وہ یک قومی نظریے

کی علم بردار تھی اور مسلمانوں کو اپنی تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ ایک طرف تو اس کی آواز میں مزید اثر اور قوت پیدا ہو جائے اور انگریز اسے سارے ملک کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت تسلیم کر لے اور دوسری طرف اس کی کوشش یہ تھی کہ واحد ہندوستانی قومیت کا نعرہ بلند کر کے ملک کی غیر ہندو اقوام کی ہستی کی عملاً نفی کر دی جائے، اور ان کو اس راستے پر ڈال دیا جائے جو پر چل کر ان کے لیے اپنی الگ ہستی کو برقرار رکھنا ناممکن ہو جائے۔

انڈین نیشنل کانگریس ملک و قوم کے نام پر بہ ظاہر جو کچھ کر رہی تھی یا کرنے کا دعویٰ کرتی تھی، اس سے بے شمار بھولے بھالے مسلمان دھوکا کھا سکتے تھے اور انھوں نے دھوکا کھایا مگر سرسید کی تیز نگاہ سے کانگریس کی کوئی چال چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ انھوں نے کانگریس کے فلسفے، نقطۂ نظر اور طرز عمل کے ایک ایک رخ پر نگاہ ڈالی اور اس کے ظاہر کے پیچھے جو جذبہ اور نیت کارفرما تھی اسے بے نقاب کر دیا۔ کانگریس کُل ملک کے لیے (غیر ہندو اقوام کو تسلیم کیے بغیر) جمہوری طرز حکومت چاہتی تھی۔ سرسید نے اس طرز حکومت کو ہندوستان کے لیے غیر موزوں اور ناقابل عمل قرار دیا۔ کانگریس یک قومی نظریے کا پرچار کر رہی تھی، سرسید نے اس کی پُرزور تردید کی۔ کانگریس کی کوشش تھی کہ مسلمان غیر مشروط طور پر اس کی تحریک میں شامل ہو جائیں۔ سرسید نے نہ صرف مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا بلکہ خود کانگریس کو بھی خبردار کیا کہ اس کی یہ روش بالآخر مسلمانوں کو تلوار ہاتھ میں لینے پر مجبور نہ کر دے۔ کیونکہ کانگریس کی اپنے ارادوں میں کامیابی کا مطلب یہ ہوگا کہ اکثریت اقلیت پر ظلم کرنے کا سیاسی جواز ہاتھ آجائے گا اور مسلمان اسے کبھی برداشت نہ کریں گے۔ اپنے ایک مضمون میں کانگریس کے اس پروگرام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کُل دنیا کے ممالک میں سے ہندوستان جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں، ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقے کے لیے موزوں ہے اور میں اس تجربے کو جو انڈین نیشنل کانگریس کرنا چاہتی ہے ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ کُل اقوام ہند کے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے کیونکہ اگرچہ مسلمان مینارٹی میں ہیں لیکن سب سے بڑی متحد مینارٹی (اقلیت) ہیں اور کم از کم روائتاً اس بات کے عادی ہیں کہ جب مجارٹی ظلم کرے تو تلوار ہاتھ میں لے لیں۔"

سرسید کا یہ الٹی میٹم اور پیشین گوئی حرف بہ حرف درست نکلی۔ کانگریس اپنی روش اور اپنی چالوں سے باز نہ آئی۔ جو موقف اور جو مقصد اوّل روز اس نے اپنے سامنے رکھا تھا، مسلمانوں اور بالخصوص آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک طاقت ور سیاسی جماعت بن جانے کے باوجود وہ اسی پر کاربند رہی حتیٰ کہ تنگ آکر اور آبرومندانہ مصالحت کی کوئی راہ نہ دیکھ کر مسلمانوں کو تقسیم ملک کا مطالبہ کرنا پڑا۔ کیا پاکستان کا مطالبہ کانگریس کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ نہ تھا اور کیا بالآخر مسلمانوں کو "تلوار ہاتھ میں" لینی نہ پڑی؟

انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سرسید نے پچھلی صدی کے آخری بیس سالوں میں جو رویہ اختیار کیا اور جس طرزِ عمل کی طرح ڈالی، بعد میں علامہ اقبال اور قائداعظم نے اسی کی متابعت کی۔ آپ علامہ اقبال کے مشہور سیاسی خطبے اور قائداعظم کی تقریریں اور بیانات پڑھیے اور سرسید کے وہ مضامین اور لیکچرز دیکھیے جو سیاسی نوعیت کے ہیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ سرسید اگرچہ انگریزی دان نہ تھے اور جدید سیاست کے پیچ و خم جاننے اور سمجھنے کی شاید انھیں ایسی تربیت نہ تھی جو بعد کی ہندوستانی نسل کو میسّر آئی مگر انھوں نے اپنے زمانے کی پیچیدہ صورتِ حالات کا نہایت حقیقت پسندانہ اور درست تجزیہ کیا تھا اور جو دلائل و براہین اور نقطۂ نظر، بالخصوص ہندوؤں کی سیاست کے بارے میں انھوں نے دیا، بعد کے مسلمان رہنماؤں نے اسی کو آگے بڑھایا اور اس میں مزید قوت پیدا کرکے پاکستان حاصل کیا۔